فردوسی اور اقبال

چند نادر فکری مماثلتیں

ڈاکٹر وحید عشرت

فردوسی اور اقبال میں جن چیزوں کو میں مشترک دیکھتا ہوں وہ نمایاں طور پر تین ہیں۔ پہلے نمبر پر فردوسی اور اقبال دونوں کی انسانی شخصیت کے غیر متغیر اور اساسی خصائص سے دلچسپی ہے دونوں شخصیت سازی پر خصوصی زور دیتے ہیں اور کسی ایسے عظیم کردار کی اپنے شعر و فلسفہ میں یافت اور تشکیل کے آرزومند ہیں جو تاریخ کے عمل میں مؤثر طور پر دسترس رکھتی ہو۔ فردوسی اپنی داستانوں کے کرداروں میں کسی فرد مصدقہ یا مرد بزرگ کی کردار سازی کرتا ہے تو اقبال اپنے فکر و فلسفہ میں فرد مصدقہ یا مرد مومن کے روپ میں ایسے کردار کا متلاشی ہے جو مسلمانوں کو حرکت و عمل دے کر عصر جدید میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خواب کو تعبیر دے سکے۔ اقبال کے الفاظ میں وہ اپنی خودی کی شناخت رکھتا ہو۔ اپنے سیرت و کردار میں منفرد، یکتا اور یگانۂ روزگار ہو۔ فردوسی کے ہاں ایسے شخص کی تلاش کی آرزو لاشعوری یا تحت الشعوری اور دھیمی ہے وہ اپنی داستانوں میں ایسے کرداروں کی جب ان کے خواص کے بیان سے تشکیل کرتا ہے تو ان کرداروں کی بلند ہمتی، اولعزمی اور یکتائی اس کے قاری کے اندر گھس کر اس کی اپنی خواہشات اور آرزوؤں میں تحریک پاتی ہے اور دھیرے دھیرے اس کے کردار کو اس کے آئیڈیلز کی کھوج اور اسے اپنے اندر سمانے کی خواہش کو بیدار کر کے تحویل کردار کا باعث بنتی ہے۔ یوں فردوسی لاشعوری طور پر اپنے قاری کے کردار پر انمٹ نقوش مرتسم کرتا چلا جاتا ہے۔

اقبال نے فرد کی اسی فردیت اور انفرادیت کو بلند آہنگ کر کے اسے شعوری سعی بنا دیا اور اپنے فلسفۂ خودی سے جو انہوں نے اسرار خودی میں خود ایک انسان کی اپنی ذاتی شخصیت کی

ہئیت اور ساخت سے تشکیل پاتا ہے کو نہایت لطیف، فلسفیانہ پیرائے میں اسلوب شعر میں ڈھال دیا۔ انسانی شخصیت کے ان غیر متغیر اور بنیادی خصائص کی بابت کا مکمل فردوسی میں تاریخی نظر سے نھا وہ تاریخ کے واقعات کے تناظر میں اور بساط ماضی پر گزرے ہوئے کرداروں کے اعمال سے اپنی محبوب شخصیت کا نظارہ کرتے ہیں یوں ان کی سوچ اور شخصیت سازی کا سارا تفکر ماضی سے ماضی کی طرف سفر کرتا ہے تاہم اس کے ہاں اس دبی ہوئی خواہش کا بھی سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ فردوسی محض داستان سرائی سے سوا بھی چاہتے ہیں کہ بساط تاریخ کے ان زندہ اور روشن کرداروں سے جلا پا کر مستقبل سے بھی کوئی کردار ان شخصیتوں میں ڈھل جائے۔ اس کی مثال یوں دوں گا کہ آپ کوئی ڈرامہ دیکھتے ہوئے تاریخی ناول یا تاریخی کہانی پڑھتے ہوئے یا کسی جنگ کا حال پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یوں بھی محسوس کرنے لگتے ہیں جیسے آپ قاری نہیں بلکہ اس ڈرامہ، کہانی یا جنگ کے ہی ایک کردار ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں واقعاتِ کربلا میں سے فرات کے کنارے لگے خیموں کا حال پڑھتا اور تیروں کی بورش اور تیغ زنی کے جوہر کھلتے ہوئے پڑھتا تو یوں محسوس کرنے لگتا جیسے میں بھی یزیدی قوتوں کے خلاف لڑنے والا کوئی ایسا کردار ہی ہوں جو حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں حضرت حرؓ کی صورت میں موجود ہوں۔ صلیبی جنگوں کے احوال اور پرانی لوک داستان کے کرداروں کی گونج ہمیں ان کو پڑھتے پڑھتے یا سنتے سنتے اپنے اندر ضرور محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا فردوسی کا شاہنامہ کے لکھنے سے مطلب یقیناً اپنے آبا یا اپنے خطے کی تاریخ کو محفوظ کرنا ہے۔ مگر آخر تاریخ کس لیے محفوظ کی جاتی ہے اسی لیے ناکہ آنے والی نسلیں اپنے آبا کے نقوش لائے قدم پہ چل سکیں۔ اور انہیں اپنی منزل کے نشان واضح طور پہ نظر آ سکیں۔ یوں فردوسی کی تاریخیت میں ماضی کی طرف سفر میں بھی مستقبل کی طرف روشنی کی ایک کھڑکی ضرور کھلی ہے۔ تاہم فردوسی کو اقبال سے زیادہ واضح طور پہ متشخص کرنے کے لیے ہم یہ کہیں گے کہ شخصیت سازی کے غیر متغیر اور بنیادی خصائص کی تلاش میں اس کی نظر تاریخی جہت میں زیادہ نمایاں تھی۔

اس کے برعکس اقبال کی نظر ان ہی شخصیت سازی کے غیر متغیر اور بنیادی خصائص کی طرف تقدیری تھی۔ جس طرح فردوسی کی تاریخیت میں اور ماضی پرستی میں مستقبل میں بھی ایک کھڑکی کھلی ہے اسی طرح اقبال کے ہاں بھی ماضی کا سراغ یوں ہے کہ اقبال بھی شخصیت کے غیر متغیر اور بنیادی خصائص کی معراج حضور نبی اکرم حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں دیکھتا ہے اور ان کی ذاتِ معتبر سے ہی ان متذکرہ خصائص کی توصیف پاتا ہے۔ مگر اپنی تقدیری

نظر ہیں وہ اپنا سفر ماضی سے ماضی میں مراجعت سے بڑھ کر ماضی سے مستقبل کی طرف کرتے ہوئے ان غیر متغیر اور بنیادی خصائص کی جمال آرائی آئندہ کے امکانات سے مختص کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسانی انا، انسانی خودی یا انسانی ایغوان غیر متغیر اور بنیادی خصائص کو مستقبل میں بھی اپنی ذات میں متشخص کرے اور خودی اپنی تعمیر و تشکیل میں ان خصائص میں اپنی تکمیل و ارتقاء سے بہرہ ور ہو اقبال کے نزدیک انسانی خودی کی معراج ان ہی خصائص کی اپنے اندر تجذیب ہے۔ اقبال کی تقدیری نظر انسانی انا میں ان خصائص کا ظہور مستقبل کے امکانات میں چاہتی ہے جبکہ فردوسی کے ہاں یہ خصائص تاریخیت کے حوالے سے گزر رہے ہوئے دھارے کا زیادہ نمایاں وصف ہے۔

بہر طور انسانی شخصیت کے بنیادی اور غیر متغیر خصائص سے دونوں کی دلچسپی ان کی فکر میں ایک متحرک رشتہ ضرور ہے اور دونوں بطلیت کو اپنے اپنے تراشیدہ کرداروں کا خاصہ ضرور گردانتے تھے۔ فردوسی یہ بطلیت رستم و سہراب نوشیروان، اردشیر اور دیگر سلاطین ایران میں دیکھتا ہے جبکہ اقبال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات میں انسانی عظمت کے تمام رنگ دیکھتا ہے۔ جیسا کہ اقبال نے خطبات میں لکھا ہے۔ نبی اپنے روحانی تجربے سے سرشاری کے باوجود چونکہ آب و گل کی دنیا میں واپس آجاتا ہے اور اس کے پیش نظر انسانی تہذیب و تمدن کی مشاطگی کا فریضہ ہوتا ہے لہٰذا نبی کی بطلیت میں نسل انسانی کے مستقبل میں نظارگی کے امکانات زیادہ متعین ہوتے ہیں۔ لہٰذا اقبال کی بطلیت استحکام خودی کا منظر نامہ مستقبل میں زیادہ موزوں دیکھتی ہے اور وہ ماضی کی تاریخ کا حصہ بننے کی بجائے مستقبل کی تاریخ گر ہوتی ہے۔ یوں فردوسی کے ہاں بطلیت کا پھیلاؤ ماضی میں اور اقبال کے ہاں اس بطلیت کا پھیلاؤ حال اور مستقبل میں زیادہ ہے۔ فردوسی کی بطلیت کے نمائندے رستم و سہراب طرز کے لوگ ہیں تو اقبال کی بطلیت مستقبل میں قائداعظم محمد علی جناح کی صورت پاکستان میں اور امام خمینی کی صورت میں انقلاب ایران کی نوید بنتی ہے۔ اور نجانے ابھی اقبال کی خودی پر اپنی انا کو مستحکم کرنے والی بطلیت کا ظہور کن کن پیکروں میں ہوگا۔ یوں فردوسی کے تناظر تاریخ یا انسانی خودی کے مظاہرات سے اقبال کا کینوس زیادہ فراخ ہے مگر فردوسی کی تقدیم اقبال کی فکری بُنت کا ایک حصہ ہے۔ فردوسی کے اسلوب نظر نے بھی سبک اقبال کی آب یاری کی ہے اور انسانی خودی کی پرتیں کھولنے میں فردوسی اقبال کے لیے سامان فکر فراہم کرتا ہے۔ بالِ جبریل میں اقبال فردوسی کے ہی ایک شعر سے حفظ خودی کے معانی اخذ کرتے ہیں اور فردوسی کے شعر کی تضمین کرتے ہوئے

اس کی عظمت کے معترف ہوتے ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں:

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض
یہ کہتا ہے فردوسی دیدہ ور
عجم جس کے سرمے سے روشن بصر
"ز بہر درم تند و بدخو مباش
تو باید کہ باشی، درم گو مباش"

اقبال فردوسی کو دیدہ ور کہتے ہیں اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ عجم کی آنکھ اس کی بصیرت افروز شاعری سے روشن ہوئی ہے۔ فردوسی اقبال کی نظر میں ایک ایسا شاعر ہے جو کسی بھی زبان کا گل سرسبد، سرمایۂ افتخار اور وجہِ امتیاز ہوتا ہے جیسا کہ انوری نے کہا تھا کہ فردوسی خدائے سخن ہے اور وہ اس خدائے سخن کا معمولی بندہ ہے۔ انوری جو خود قصیدے میں اپنی مثال آپ ہے اور فارسی شاعری نے جس سے بڑا شاعر کم پیدا کیا ہے۔ جب فردوسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتا ہے تو کسی اور کو دم مارنے کی کیا جرات ہو سکتی ہے۔ علامہ ابن الاثیر نے اپنی کتاب مثل السائر کے اختتام پر فردوسی کا موازنہ عربی شاعری سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"عربی زبان باوجود اس وسعت و کثرتِ الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کر سکتی اور درحقیقت یہ کتاب عجم کا قرآن ہے۔"

علماء نے مثنوی مولانا روم کو بھی در زبان پہلوی قرآن کہا ہے۔ مگر شکوہِ زبان کے ساتھ ساتھ تفکر اور حکمت کا اعجاز مثنوی کی معنویت کو دوچند کر دیتا ہے جبکہ فردوسی کے ہاں زبان اور واقعات کا بیان جس معجز بیانی کے ساتھ سامنے آیا ہے اس نے ایرانی زبان میں شاہنامہ کو بھی یکتائے روزگار بنا دیا ہے۔ فارسی زبان میں ایک سے ایک بڑا شاعر اپنی زبان و بیان، فصاحت و بلاغت اور شکوہ و دبدبہ کے لحاظ سے موجود ہے۔ فردوسی اور رومی کے علاوہ انوری، سعدی، حافظ، عرفی، بیدل، حکیم ستائی، عمر خیام، جامی، نظامی گنجوی، فرید الدین عطار، قاآنی، ابن یمین، ابو طالب کلیم، فغانی شیرازی فیضی، نظیری، طالب آملی، غالب اور میرزا صائب ایسے شعرا ہیں جو اتنی کثرت سے شاید دنیا کی کسی زبان میں بھی موجود نہیں بلکہ اگر یوں کہوں کہ شعر نے فارسی زبان میں اپنی معراج کو چھوا ہے تو یہ اتنی ہی سچی بات ہوگی جتنی سچی بات یہ ہے کہ بلاغت میں عربوں کا کوئی ثانی نہیں۔ اعجاز بیان میں فارسی

فردوسی اور اقبال

زبان اپنی شیرینی میں دنیا کی شاید ہر زبان سے آگے ہے۔ فارسی زبان کی اس معجز بیانی میں فردوسی آسمانِ سخن کا شمس الدجا ہے، بدر منیر ہے اور جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

در شعر سہ تن پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

فردوسی نے ابیات کے فن میں فارسی شاعری کو اپنی انتہا تک پہنچا کر اسے حرفِ آخر کر دیا۔ اقبال بھی فردوسی کی بلند قامتی کا اعتراف کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض نے اپنی کتاب "اقبال اور فارسی شعراء" میں فردوسی کے باب میں لکھا ہے کہ:

"اکتوبر و نومبر ۱۹۳۳ء میں اقبال چند دن کے لیے افغانستان تشریف لے گئے، جہاں وہ حکومتِ افغانستان کے مہمان تھے اور اس سفر کی یادگاران کی پوری مثنوی مسافر اور بال جبریل کی چند نظمیں ہیں۔ غزنی میں سلطان محمود کے مزار کی زیارت کے دوران اقبال کو خرابہ ہائے شہر میں شکوہ و جلال محمود کی یاد آگئی، اور ضمناً مداحانِ دربار کی، جن میں فردوسی بھی شامل تھا۔ اقبال اپنے خیال سفر میں تاریخِ گزشتہ کے دریچے میں جھانک کر فرماتے ہیں:

نکتہ سنج طوس را دیدم بہ بزم
لشکر محمود را دیدم بہ رزم
دولتِ محمود را زیبا عروس
از حنا بندان او دانائے طوس

نکتہ سنج طوس اور دانائے طوس سے مراد فردوسی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ اقبال کی نظر میں فردوسی ایک بلند پایہ نکتہ سنج دانائے طوس تھا۔ ایرانی تہذیب اس کے سرمے سے روشن بصر ہوئی اس نے عجم کو اپنے شاہنامے کے ذریعے لازوال زندگی عطا کی اور یوں وہ ابیات کا پیمبر کہلایا۔ مگر فردوسی کی عظمت صرف لطفِ بیان تک نہیں وہ اپنے اشعار میں انسانی عروج و زوال کی فلسفیانہ توجیہ بھی اپنی تاریخیت کے بیان میں کرتا ہے اور یوں تاریخی واقعات کے بیان سے وہ ان معروضی اصولوں کا پتہ دیتا ہے جو کسی قوم کو عظمت اور کسی قوم کو ضلالت اور ذلت کی طرف لے جاتے ہیں۔ فردوسی نے گرچہ واضح طور پر یہ اصول نہیں گنوائے مگر ہم فردوسی کے اشعار کے مطالعہ سے از خود ان اصولوں کی اس کے کلام سے تخریج کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں اقبال کے نزدیک تاریخ واقعات کا محض گراموفون ریکارڈ نہیں بلکہ انسانی علوم کے ماخذ کی حیثیت سے یہ بھی آیت الٰہی ہے۔ قرآن تاریخ کو ایّام اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ تاریخ اقبال کی نظر میں ایک زندہ عضویہ ہے۔ ایک زندہ حقیقت، قرآن کے نزدیک واردات علم کا ایک سرچشمہ۔ اقبال نے مذہبی مشاہدہ کے ساتھ ساتھ عالم فطرت اور عالم تاریخ کو بھی قطعی اور اہم قرار دیا ہے کیونکہ عالم تاریخ کی اساس عقل اور تجربے پر ہے۔ واقعات کے تناظر میں انسانی تجربہ کا دوران، انسان کو دوسرے انسانوں کے حوالے سے ان کے اعمال کے پس پردہ جاری تہیجات و تحریکات کا شعور عطا کرتا ہے اور انسان ان تجربات کے تواتر سے اصول استقرا سے جزئیات سے کلیات میں تعمیمات کرتے ہوئے انسانی کردار کے بہاؤ میں توازن اور تسلسل کے اصول وضع کرتا ہے۔ یوں ہم عالم تاریخ سے علم کی ایک نئی دنیا کی دریافت کرتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں گرچہ انسانوں کے اجتماعی رویے بھی منعکس ہوتے ہیں۔ مگر تاریخ کی سطح پر جو کردار ابھرتے ہیں ان کی نفسیاتی تشکیلات اور رویوں کی لاشعوری اور شعوری وارداتوں کے محرکات سے بھی آگاہی ہوتی ہے یوں ہم فرد سے سماج یا اجتماع اور انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف انسان کے سفر میں تاریخ سے اکتساب کرتے ہیں اور تاریخ ہمیں تہذیبوں، تمدنوں اور ثقافتوں کی ساخت اور ان کے مٹ جانے کے اصولوں سے آگاہ کرتی ہے۔ قرآن نے قوم عاد و ثمود، بنی اسرائیل اور ایسی ہی متعدد اقوام کے واقعات سے جس بصیرت سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی ہے اس کا تعلق عروج و زوال کی اسی جانگاہ سے ہے اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام و امم کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ تاریخ اس بات پر استناد کرتی ہے کہ اقوام کو ان کی بداعمالیوں کی سزا یہیں ملتی ہے جبکہ افراد کے لیے روز جزا مقرر ہے۔ تاریخ کے تناظر میں انسان فرد سے اجتماع کی طرف سفر کرتا ہوا اپنے تجربات کی گوناگونی سے ہمیں آگاہ کرتا ہے۔ تاریخ کا معروض انسان ہے۔ تاریخ کا معروض ہمیں جس علم سے آگاہی دیتا ہے وہ ادراک بالحواس پر مشتمل ہونے کی وجہ سے تجربی اور سائنسی ہے اور وہ اپنی توجیہ میں آفاقی اور عالمگیر نتائج کا حامل ہے۔ اس کی مفرد مثالوں سے تعمیم کے ذریعے آفاقی اصول کی تخریج اسے استقرائی منطق پر استوار سائنس بنا دیتی ہے اور اس کا علم دوسرے انسانی تجربے یا دوسرے معروضات کے علم کی طرح معتبر قرار پاتا ہے۔ قرآن مجید نے تاریخی تنقید کا یہ بنیادی اصول قائم کیا کہ بطور ایک علم تاریخ کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کا مواد جن واقعات سے تیار کیا جاتا ہے ہمیں اس کی صحت کا یقین ہو۔ اور یوں ہماری موضوعی نفسیاتی کیفیات میں واقعاتی حوالے سے موضوعی اور انفرادیت سے اجتماعیت وارد ہو جاتی ہے

اور خودی اپنے اسرار کھولتی ہوئی بے خودی کی طرف اپنا رخت سفر باندھتی ہے۔

فردوسی نے تاریخ کو علم کے سرچشمہ کی حیثیت سے زمانے کی دست برد سے محفوظ کر دیا۔ شاہان ایران کی تاریخ ان کے عروج و زوال، ان کی محبتوں اور نفرتوں، ان کی جنگوں اور صلح و آشتی کی باتوں کے تناظر میں ہمیں جو ادراک بالحواس ہوتا ہے اس سے استقرائی تعمیم کے ذریعے قوموں کے عروج و زوال کے معروضی اصول وضع کیے جا سکتے ہیں۔ شاہنامہ کی اس عظیم داستان میں انسانوں کے موضوعی رویوں سے ان کی انفرادی نفسیاتی کیفیتوں اور وارداتوں سے ہم ایرانی قوم کی اجتماعی نفسیات اور معروضی رویوں کی شناخت کر سکتے ہیں۔ یوں یہ ساٹھ ہزار اشعار پر پھیلا ہوا شاہنامہ انسانی رویے کے انفرادی اور اجتماعی علم کے لیے ادراک بالحواس کا ایک وسیع دفتر ہے جو اپنی خوبصورتی اور رعنائی اظہار کے ساتھ ساتھ انسانی رویے کے انفرادی اور اجتماعی علم کا ایک نہایت ہی معتبر ذریعہ ہے۔ فردوسی کی تاریخ گوئی اس شاہنامے میں خود تاریخ کو ایک زندہ عضویہ یا زندہ حقیقت میں بدل دیتی ہے اور اظہار کا دھارا، بیان کا تسلسل اور واقعات کا کڑی کڑی آپس میں پیوست ہونا سارے عمل میں ایک وحدت کو جنم دیتا ہے۔ اور یوں فردوسی کی زبان میں ایرانی قوم کی تاریخ ایک زندہ و پائندہ عمل میں ڈھل جاتی ہے جہاں افراد سانس لیتے، باتیں کرتے، تیر زنی اور تیغ بازی کرتے ہوئے زندہ انسانوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ فردوسی کی ندرت بیان نے ابلاغ کے کمالات کو اتمام حجت میں ڈھال دیا ہے۔ اس سے تاریخ ہمارے لاشعور میں علم اور تجربے کا خود ہی حصہ بنتی چلی جاتی ہے اقبال نے جس فلسفہ تاریخ کا ابلاغ دیا ہے وہ بیان فردوسی میں خود سمویا ہوا صاف نظر آتا ہے۔

فردوسی نے اقبال کے دوسرے اصول تاریخ کو بھی بہ تمام و کمال نبھایا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کے بقول فردوسی نے اپنے عہد کے تمام تاریخی مواد سے استفادہ کیا، اس کی چھان پھٹک کی واقعات کے تاریخی تسلسل کی جزئیات اکٹھی کیں اور واقعات کی صحت کا پوری طرح اہتمام کیا تاکہ مورخ ان واقعات کی حجیت کو چیلنج نہ کر سکے، بعض مافوق الفطرت یا مافوق الانسانی واقعات کے بیان کے سوا تاریخ کی صحت کہیں مجروح نہیں ہوتی بلکہ بعد کی تاریخوں نے بھی فردوسی کے علم تاریخ کی حجیت پر صاد کیا یوں تاریخ کے بطور ماخذ علم ہونے اور واقعات تاریخ کی قطعیت کے بارے میں فردوسی اور اقبال میں اشتراک فکر موجود ہے اور فلسفہ تاریخ میں دونوں میں ایک ذہنی یگانگت پائی جاتی ہے۔

انسانی انا یا خودی کے لیے غیر متغیر اور اساسی خصائص کی موضوعی نفسیاتی بنیاد کے سلسلے میں فردوسی اور اقبال کی مماثلت سے تاریخ کے ادراک بالحواس پر مشتمل معروضی تجربے تک ہم آہنگی سے

خودی اقبال کے ہاں جس بے خودی کی طرف سفر کرتی ہے وہ بھی فردوسی کے ہاں مختلف کرداروں کے اجتماعی رویّے سے تراشیدہ ہے مگر فردوسی کے ہاں یہ اجتماعیت ماضی کے منظرنامے میں بند ہے جبکہ اقبال کی تقدیری نظر اسے مستقبل کی جہت یا سمت کی طرف موڑ دیتی ہے۔ اور وہ انسانی شخصیت کے سماجی اور عمرانی امکانات میں ایک نئے اجتماع، نئے سماج، نئے معاشرے اور نئی ریاست کے پیکر میں ڈھلتا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ اقبال کی تاریخیت میں یہ انقلاب اقبال کے تصورِ نبوّت سے پیدا ہوا جو ایک صوفی اور ایک نبی کے روحانی تجربے کی نوعیتوں کے اختلاف سے اقبال نے ظاہر کیا مولانا عبدالقدوس گنگوہی نے کہا کہ "محمدؐ عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد۔ واللہ اگر من رفتمی ہرگز باز نیامدے"۔ اقبال کہتا ہے کہ صوفی اپنے روحانی تجربے کی سرشاری میں اتحاد کی جس لذّت سے شادکام ہوتا ہے اس سے باہر آنا پسند نہیں کرتا کیونکہ صوفی کے لیے تو لذت اتحاد ہی آخری چیز ہے جبکہ نبی کی بازآمد تخلیق ہوتی ہے وہ اس واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانے کی رَو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ و تصرف سے جو عالمِ تاریخ کی صورت گر ہیں، مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔ لہٰذا نبی کا مشاہدہ باطنی صورت گر انقلاب ان معنوں میں ہوتا ہے کہ وہ سماج، معاشرہ اور ریاست کی نئے مقاصد کے تحت تنظیم کرتا ہے اور یوں یہ انفرادی تجربہ نئے اجتماعی قالب میں اپنا ظہور سامنے لاتا ہے۔ اور انسانوں کے لیے نئے عمرانی اور سماجی انقلاب کی نوید بنتا ہے۔ قرآن جو نبی کے روحانی تجربے، عالمِ فطرت کے احوال کے مطالعے اور تاریخ کی صورت میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی رویوں سے آگاہی کا خزینہ ہے اقبال کے ہاں اپنے انہی تینوں خواص کی بنا پر سرچشمہ علم ہے جو استقرائی تعمیم کے ذریعے ہمیں ہر زمان اور ہر مکان میں ایسی حکمت و بصیرت سے شاداب کرتا ہے جس سے ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی رویوں کی تشکیل کے لیے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں یہاں اقبال فردوسی سے بڑی ہی مختلف سمت میں اپنی شناخت کراتا ہے اور اگر سچ پوچھئے تو یہاں اقبال کا شعور مثنوی مولوی معنوی کے شعور و حکمت دین سے قربت حاصل کرتا ہے۔ اور فرد سے اجتماع تک انسانی رویوں کی مختلف تشکیلات میں مرید ہندی پیر رومی سے صدیوں بعد اپنا رشتہ جوڑتا ہے جو رومی کے بعد ہمیں اردو یا فارسی یا عربی میں کہیں نظر نہیں آتا۔ فکر رومی کی روئیدگی فکرِ اقبال میں صدیوں کے بُعد کے باوجود چمکنے لگتی ہے اور قرآنی حکمت کی جو تفہیم رومی نے مثنوی میں ظاہر کی تھی وہ اقبال کے شعر و فلسفہ میں ابلاغ ہوتی نظر آتی ہے۔ مصری عالم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے کہا تھا کہ:

رومی اور اقبال

"اگر جلال الدین رومی اس زمانے میں جی اٹھیں تو وہ محمد اقبال ہی ہوں گے ساتویں صدی کے جلال اور چودھویں صدی کے اقبال کو ایک ہی سمجھنا چاہیے۔"

میری نظر میں اقبال فکرِ رومی کا تکملہ ہے۔ رومی کی حکیمانہ روایت کی اقبال توسیع ہے عصرِ حاضر میں یہ رومی کا نیا ظہور ہے۔ پیرِ رومی کی تفہیمِ دین مریدِ ہندی میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ حکمتِ قرآنی ایک پورے فلسفیانہ نظام میں نمودار ہوئی۔ قرآنِ کریم کی حکیمانہ تفہیم اور اس کی غایت جاننے میں اقبال کو سب سے زیادہ تحریک مثنوی رومی سے ملی۔ خود اقبال معترف ہے کہ جس طرح مولانا رومی نے دورِ فتنہ عصرِ کہن کو فرو کرنے کے لیے اذان دی اسی طرح میں نے دورِ فتنۂ عصرِ رواں میں اذان دی اور میں نے یہ اسرار رومی سے حاصل کیے۔ ایک پُرفتن دور میں جس میں عقائد و نظریات کی شکست و ریخت ہو رہی تھی اور مسلمانوں پر بے چارگی طاری تھی۔ مولانا رومی نے انسانی یقین و اعتماد کو بحال کیا اور عقائد و نظریات میں اپنی فکرِ رسا سے محکمی پیدا کی یہ تشتت، شکستہ حالی اور درماندگیِ فکر و نظر اقبال کے دور کا بھی خاصہ تھی۔ مولانا رومی اور اقبال کی یہ ہم آہنگی اور فکری بلوغت، قرآن سے رغبت اور نسبت ان دونوں عالی دماغ لوگوں کے لیے نکتۂ اتصال ہے۔ مولانا رومی اقبال کے لیے کشافِ اسرارِ حکمتِ قرآن ہیں۔ مولانا رومی کے پہلو بہ پہلو اور شاید بعض صورتوں میں زیادہ مؤثر طور پر فکرِ اقبال کی ہیئت کی تشکیل حضرت مجدد الف ثانی نے کی۔ وحدت الوجودی تصورات جو افلاطون، فلو، فلاطونس اور ابنِ عربی کے راستے سے مسلم سماج میں سرایت کرنے لگے تھے جس کے نتیجے میں سکر غالب آگیا۔ پورا مسلم سماج اس سے مفلوج ہو کر عمل کو ترک کر کے زوال آمادہ ہو گیا۔ اس وحدت الوجودی رویے اور سکر کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا کرنے میں حضرت مجدد الف ثانی نے پیش قدمی کی۔ اقبال کا فلسفۂ خودی بھی حضرت مجدد کے تصورِ مقامِ عبدیت کی بازگشت ہے، کیونکہ حضرت مجدد کے نزدیک مقامِ عبودیت تمام مقامات سے بلند ہے۔ محبوبوں کو محبوب کی بندگی میں اُنس نصیب ہوتا ہے۔ محبوب اور محب میں حجاب صرف نفس ہے۔ محب چونکہ ذوقِ شہود سے لذت لیتا ہے بندگی سے شادکام ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے مقامِ بندگی اور مقامِ عبودیت کو کبھی ترک نہیں کرتا وہ اس بندگی میں اپنی انفرادیت چاہتا ہے۔ مقامِ بندگی پر سرفراز ہونے کی وجہ سے وہ کسی اور مقام کا طالب نہیں ہوتا۔ مجدد الف ثانی کے ہاں جو چیز مقامِ عبدیت اور مرتبہ قیومیت ہے وہی اقبال کے ہاں مقامِ خودی ہے۔ یہ موضوع خود تفصیلی بحث چاہتا ہے انشاء اللہ اسے الگ کسی مقام پر بیان کیا جائے گا۔ اقبال نے حضرت مجدد کے اتباع میں اسلام کی حکمت سے انسانی انا یا خودی کا تصور کشید کر کے خدا اور بندے میں

تعلق کی نئی جہتیں دریافت کیں۔ اور رموزِ بے خودی میں اس خودی کو ایک ایسے معاشرتی اور عمرانی اُٹھان دی جو اسلام کی نظریاتی ریاست کے لیے ایک انقلابی اساس فراہم کرتی ہے جن میں تمیزِ آقا و بندہ حرام ہو جاتی ہے جس ریاست کے تمام افراد عدل و احسان کی تصویر ہوتے ہیں جہاں افراد اپنے معاشرہ یا ریاست کی بقا اور ترقی کے لیے سرگرم ہوتے ہیں اور ریاست افراد کے لیے مخنّع بننے کی بجائے ان کی ذہنی صلاحیتوں کی تعمیر کا یارا کرتی ہے۔ اقبال کے ہاں فرد ریاست کا یا ریاست فرد کی دشمن نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تعمیر و ترقی کے لیے اساس فراہم کرنے والے ہیں جبکہ یورپی فلاسفہ مثلاً کانٹ، نطشے اور سارتر سماج کو فرد کا اور فرد کا سماج کو دشمن ثابت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

سارتر نے تو اپنی وجودیت کی اساس ہی دوسرے آدمی کے وجود کے جہنم ہونے پر استوار کی۔ یورپی تہذیب میں انسان دوستی کی بجائے مردم بیزاری کی روشِ ان ہی فلاسفہ سے پھوٹی ہیں اور یہ سارا کشت و خون جو اس وقت پوری دنیا میں ہو رہا ہے یہ مغربی تہذیب کا ہی برگ و بار ہے کہ اس کی اساس ہی مسیحی تصوریت کے اس خیال پر ہے کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے جبکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً معصوم ہے وہ خدا کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہ اس کے ماں، باپ، معاشرہ یا گردو پیش ہے جو اسے گناہ کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرنا چاہوں گا کہ یورپ کا یہ پروپیگنڈہ ہے کہ دنیا میں مذہب کے نام پر جس قدر کشت و خون ہوا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ کسی اور وجہ سے اتنا قتل نہیں ہوا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یورپ کے نسلی تفاخر، ہوسِ زرگری اور وطنی نیشنلزم نے گزشتہ صدیوں سے جو غارت گری پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی صورت میں کی ہے مذہب کے نام پر ہونے والی خونریزی اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ آج بھی ناگاساکی اور ہیروشیما سے یورپی نسل پرستی کا دھواں اٹھ رہا ہے، تجارت کے نام پر اور ہوسِ ملک گیری اور اپنے نسلی تفاخر کے سبب انہوں نے پوری دنیا میں تباہی و بربادی کے دام بچھا رکھے ہیں۔ قبرص، کشمیر فلسطین اور خلیج سے اب بھی بے گناہ بہائے جانے والے انسانی خون کی بُو آ رہی ہے۔ عالمِ اسلام کے مختلف حساس دہانوں پر یہ ٹائم بم کس نے رکھے ہوئے ہیں۔ جمہوریت، آزادی، انسانی حقوق اور انسان دوستی کے نعرے لگانے والے یہ مغربی بھیڑیے کیوں ان کو استصوابِ رائے کا حق نہیں دلاتے۔ بات اصل یہی ہے کہ "بہر تقسیم قبور انجمن ساختہ اند" یہ اہلِ مغرب یہ ہنود و یہود مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے ہر خواب کو پریشان کرنے کے لیے متحد ہو جاتے ہیں مگر گراں خواب چینی تو سنبھل گئے ہیں خفتہ بخت مسلمان حضرت مسیح کی بھیڑوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور ان کو سوئے قطار کھینچنے

والی قیادت پورے عالمِ اسلام میں ابھی ناپید ہے۔ مگر اقبال اپنی کشتِ ویران سے ناامید نہیں اس لیے کہ جونہی اس مٹی میں نم پیدا ہوا تو اس کی زرخیزی ضرور لالہ و گل کے لہلہانے کے اسباب پیدا کرے گی۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ فردوسی کی نظر تاریخی تھی، اور اقبال کی تقدیری نظر تھی۔ فردوسی کا سفر ماضی کو معتبر و مشہود کرنے کی طرف نمایاں تھا اور اقبال کی تقدیری نظر مستقبل پر تھی۔ یوں ہماری قومی اور ملی روایت کو ماضی میں گلوری فائی کرنے کا منصب فردوسی کا تھا اور ہماری اسی ملی روایت کو حال اور مستقبل میں گلوری فائی کرنا اقبال کا منصب ہے۔ یوں ہماری روایت کی عظمت کا تسلسل فردوسی سے اقبال تک کا سفر ہے۔ فردوسی کی روایت میں رستم و سہراب جیسے بطلِ جلیل گزرے اور اقبال کی روایت میں قائد اعظم اور امام خمینی جیسے بطلِ جلیل برصغیر اور ایران میں پیدا ہوئے اور ابھی گنبدِ نیلوفری کیا کیا رنگ بدلتا ہے۔ امکانات کن کن ظہورات میں نظر آئیں گے۔ اقبال کے ظہورات کا جہان زیادہ وسیع و فراخ ہے اقبال نے اسلام کی حکمت کے ذریعے عصرِ حاضر کے لیے جو نظامِ حیات متشخص کیا وہ بھی ابھی پردہ امکان میں ہے ابھی اس کی سحر بے حجاب نہیں ہوئی۔ لیکن اقبال کے انقلابی ترانوں نے جس طرح لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند اک ولولۂ تازہ دیا اور نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر مسلمانوں کو حرم کی پاسبانی کے لیے اکٹھا کرنے کا داعیہ دیا اور تہران کو عالمِ مشرق کا جینوا قرار دے کر کرۂ ارض کی تقدیر بدلنے کا سبق دیا اگر آپ خاکِ نیل سے کاشغر تک ایک خط دنیا کے نقشے پر کھینچ دیں اور لاہور سے سمرقند و بخارا تک دوسرا خط کھینچ دیں اور پھر لاہور اور وادیٔ نیل تک تیسرا خط کھینچ دیں تو اقبال کا عالمِ نو، عالمِ اسلام کی صورت میں پردۂ تقدیر سے بے حجاب ہو کر سامنے آجائے گا اور ایک نئے اسلامی دنیا کے وفاق کو آپ دنیا کے نقشے پر دیکھیں گے۔ افغانوں کے اسلامی انقلاب نے اسلامی ترکستان میں اضطراب کی جس لہر کو جنم دیا ہے اس کے اثرات کشمیر پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ یہ بھی اقبال نے کہا تھا کہ جب وسط ایشیا میں تحریکیں برپا ہوں گی تو کشمیر میں بھی انقلاب انگڑائی لے گا۔ پس لازم ہے کہ اقبال کی یہ پیشین گوئی بھی پوری ہو کہ کشمیر آزاد ہو اور لازم ہے کہ تہران عالمِ مشرق کا جینوا بنے اور اسے متحدہ اسلامی دنیا کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو۔ امام خمینی کے اسلامی انقلاب نے جس طرح ملوکیت سے مسحور قوم کو اسلامی جمہوری روح سے لذت آشنا کیا ہے کل تک کوئی اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ پورے عالمِ اسلام میں خود شناسی کا طوفان اُٹھ رہا ہے۔ اسلامی تشخص کی موجِ تند جولاں اسی دنیا سے اٹھے گی اور

مغربی اور اشتراکی تسلّطوں سے تنظیمیں اس سے تہ و بالا ہوں گے۔ اقبال نے ہمارے لیے لازم قرار دیا تھا کہ اپنے اندر آئینہ ضمیری پیدا کریں اور سلطانی و ملائی و پیری کے امراض کہنہ سے خود کو بچائیں اور عالم اسلام میں روح اسلام کے پیشِ نظر اپنے ہاں تمدنی، ثقافتی، تہذیبی، عمرانی، معاشی اور جمہوری ادارے تشکیل دیں اور اپنے اپنے ہاں ان اداروں کی ایسی تشکیلات کریں کہ جدیدیت کے ساتھ ساتھ ان میں اسلام کی روح واضح طور پر محسوس ہو۔ اقبال نے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے مقدر کیا کہ:

"بحالتِ موجودہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ امم اسلامیہ میں سے ہر ایک کو اپنی ذات میں ڈوب جانا چاہیے اپنی تمام توجہ اپنے آپ پر مرتکز کر دیں حتیٰ کہ ان سب میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ باہم مل کر اسلامی جمہوریتوں کی ایک برادری کی شکل اختیار کر لیں۔"

یہ نیل سے تا بخاکِ کاشغر اور نیل سے لاہور اور لاہور سے سمرقند و بخارا تک پھیلی ہوئی سرزمین جب باہم اسلامی جمہوریتوں کی برادری کی شکل اختیار کر کے ایک نئی قوت بن کر ابھرے گی اس دن دنیا امن اور تہذیب کا گہوارہ بن جائے گی اور عالم اسلام اپنی نشاۃ ثانیہ کی منزل پا کر انسانیت کے لیے فوز و فلاح کی ایک نئی تاریخ مرتب کرے گا۔ یہ ہے اقبال کا خواب لحظہ لحظہ اپنی تعبیر پانے کے لیے بے تابانہ بڑھ رہا ہے اور پوری ملتِ اسلامیہ کو چاہیے کہ اس کو اپنی منزل قرار دے لیں۔ اقبال نے اسی اسلامی جمہوریتوں کی برادری یا وفاق کے لیے اجتہاد اور نئی فقہ اسلامی کی تشکیل کو لازم کر دیا تھا تاکہ اسلام مادہ پرستانہ سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے بعد بطور ایک نظام حیات کے قوموں کی امامت کا منصب ادا کرے اور تہذیب انسانی انسانیت کے لیے پھر بارآور ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ مضمون قدرے لمبا ہو گیا ہے۔ انسانی سیرت و کردار کی تشکیل کے لیے غیر متغیر اساسی خصائص اور دوسرے فردوسی اور اقبال کے تصورِ تاریخ کی مماثلت کے بعد دو ایک اور اہم مماثلتیں دونوں کے درمیان موجود ہیں وہ شعری سرمائے میں فلسفیانہ اصطلاحات کی ساخت ہے۔ گرچہ اس کے بیان کے لیے بھی ایک پورا مقالہ چاہیے تاہم مختصر آئیں یہ عرض کروں گا کہ فلسفیانہ اصطلاحات کا فارسی میں کوئی تصور نہ تھا اس لیے کہ فارسی زبان پر پہلے قصیدے کی حکمرانی تھی۔ فارسی شاعری اس وقت تک قالب بے جان تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں تھا۔ شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ قصیدہ، مداحی اور خوشامد کا نام تھا۔ مثنوی واقعہ نگاری تھی اور غزل تدح دگیسو سے یا تک محدود تھی۔ فارسی شاعری میں سب سے پہلے صوفیانہ خیالات حضرت سلطان ابو سعید ابوالخیر نے ادا کیے جو شیخ بو علی سینا کے

معاصر تھے۔ فارسی شاعری میں تصوف کی آمد کے ساتھ فلسفہ بھی در آیا بقول مولانا شبلی نعمانی فلسفہ شاعری میں تصوف کی راہ سے آیا ہے جب ہستی مطلق، وحدت وجود، فنا بقا جیسے مسائل کا بیان فارسی میں تصوف کے زیر اثر شروع ہوا۔ وہ لوگ جو صاحب حال نہ تھے اور وہ مکاشفہ اور حال کی زبان کے معارف نہ جانتے تھے انہوں نے فلسفے کا سہارا لیا اور یوں فلسفہ فارسی زبان پر بالخصوص شاعری پر چھا گیا۔ فارسی زبان میں اسی زمانے میں بوعلی سینا نے بھی فلسفیانہ کام کرنے کی کوشش کی مگر وہ عربی اصطلاحات کو فارسی فلسفہ نویسی میں لانے پر مجبور رہ گیا مگر فردوسی کی قدرت زبان کا یہ عالم تھا کہ ساٹھ ہزار اشعار میں عربی الفاظ کا ذخیرہ اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے کے آغاز میں مخلوقات کی پیدائش اور عناصر کے وجود کے حوالے سے فلسفیانہ اصطلاحات کو فارسی زبان میں اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ فارسی زبان اس پر ناز کر سکتی ہے۔ ان اصطلاحات میں سرمایہ، مادہ، گوہر توانائی، وجود عنصر، آرام، سکون، فنا، تغیر، حرکت اور ترک بالارادہ وغیرہا نے جیسی متعدد اصطلاحات فلسفہ وضع کی گئیں۔ فردوسی نے نہ صرف یہ فلسفیانہ اصطلاحات وضع کیں بلکہ ان اصطلاحات کے حوالے سے فلسفیانہ مضامین کا بھی ابلاغ شاہنامہ میں ہوا۔ اقبال نے عصر حاضر میں اپنے نظریاتی اور فکری مضامین اور پیغام کے ابلاغ میں اردو کا دامن تنگ پایا اور فارسی کو اپنے مضامین کے اظہار کے لیے جو پسند کیا تو اس کا سبب بھی یہی تھا کہ فارسی میں وہ اصطلاحات فلسفہ اپنے پورے ابلاغ کے ساتھ موجود تھیں جو اقبال کو اپنے مضامین نوع بر نوع کے اظہار کے لیے درکار تھیں۔ فردوسی اس لحاظ سے پیش رو ہے کہ اقبال کو فارسی زبان میں اپنے مضامین کے ابلاغ کے لیے دوسرے ممتاز فارسی شعرا کے ساتھ ساتھ فردوسی نے بھی فلسفیانہ اصطلاحات کا وسیع و عریض ذخیرہ فراہم کیا۔ یہ فردوسی اور ان جیسے شعرا کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے اقبال جیسے عظیم مفکر اور انقلابی کو جنم دیا ورنہ اردو کی طرح فارسی کا دامن بھی اقبال کے لیے اپنے گہرے فکری مضامین کے ابلاغ کے لیے تنگ ہوتا۔ اگر فردوسی اور ان جیسے دیگر فلسفیانہ زبان رکھنے والے شعرا فارسی زبان میں موجود نہ ہوتے۔

علامہ اقبال اور فردوسی میں جو تین فکری مماثلتیں یہاں بیان کی گئی ہیں ان میں ایک انسانی شخصیت و کردار کے غیر متغیر اور اساسی خصائص اور بطلیت کا بیان ہے تو دوسرے تاریخ کی ان دونوں کے فکر و بیان میں اہمیت ہے۔ تیسرے دونوں کا فلسفیانہ لہجہ اور شاعری میں فلسفیانہ اصطلاحات سازی کا رویہ ہے جس سے دونوں کے مضامین، بیان اور اسلوب میں گہرائی اور بلندی پیدا ہوئی۔ فردوسی کی نظر میں تاریخیت غالب تھی جبکہ اقبال کی تقدیری نظر مستقبل ساز تھی اور انہوں نے اپنی بطلیت کا ظہور امکان آئندہ

ہیں تلاش کیا اور اسلام کو ایک نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی صورت میں پیش کر کے اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا خواب دیکھا۔ یہی اقبال کی اختصاصی حیثیت تھی جس پر جناب آغا فی علی خامنہ ای نے انہیں مشرق کا بلند ستارہ کہا، ڈاکٹر علی شریعتی نے علیؓ گونہ تصور کیا اور اقبال نے عصرِ حاضر میں چونکہ شرح آئینِ پیمبر کو آشکارہ کرنے کا سامان کیا چنانچہ ملک الشعراء دیہا رنے عصرِ حاضر کو اقبال سے منسوب کر دیا کہ

قرن حاضر خاصہ اقبال گشت

حواشی

۱۔ علامہ محمد اقبال۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ بزم اقبال لاہور ۱۹۸۳ء ص ۱۸۹

۲۔ علامہ محمد اقبال، بال جبریل۔ ص ۲۱۲

۳۔ علامہ ابن الاثیر، مثل السائر بحوالہ شعر عجم جلد اول دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء ص ۱۳۹

۴۔ بحوالہ شعر عجم جلد اول۔ ص ۱۳۹

۵۔ ڈاکٹر محمد ریاض۔ اقبال اور فارسی شعراء اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء ص ۵۶

۶۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی۔ ص ۸۶۸

۷۔ علامہ محمد اقبال، شذرات فکر اقبال۔ مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، بزم اقبال لاہور ۱۹۷۳ء ص ۱۴۰

۸۔ علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ بزم اقبال لاہور۔ ص ۱۲۔

۹۔ ایضاً۔ ص ۱۶۶

۱۰۔ مولانا شبلی نعمانی، شعر عجم، دار المصنفین اعظم گڑھ لاہور۔ ص ۱۴۴

۱۱۔ علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزم اقبال لاہور ۱۹۸۳ء۔ ص ۱۸۸

۱۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال ممدوح عالم، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۸ء۔ ص ۳۷۸

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ڈاکٹر وحید عشرت، فلسفہ اقبال کے ماخذ و مصادر، اقبالیات (اردو) اقبال اکادمی۔ شمارہ جنوری جولائی ۱۹۷۸ء ص ۳۹۱

۱۵۔ دوسرے آدمی کا وجود جہنم ہے، دیکھئے وجودیت، مرتبہ جاوید اقبال ندیم میں ڈاکٹر وحید عشرت، کاژاں پال سارتر پر مقالہ۔

۱۶۔ من ازیں پیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

(کلیات اقبال فارسی، پیام مشرق۔ ص ۲۲۳)

۱۷۔ عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۱۰۰

۱۸۔ اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور تا خاکِ بخارا و سمرقند
کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۳۱۳

۱۹۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۲۶۱

۲۰۔ اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا
کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۹

۲۱۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ بزم اقبال لاہور۔ ص ۲۴۵، ۲۴۶

۲۲۔ مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم۔ ص ۱۲۰

۲۳۔ ایضاً۔ ص ۱۳۵

۲۴۔ ایضاً۔ ص ۱۴۱

۲۵۔ ملک الشعرا بہار کا علامہ اقبال کی وفات پر خراجِ تحسین
خواجہ عبدالحمید عرفانی، اقبال ایرانیوں کی نظر میں، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۵۷ء۔ ص ۴۲